Fikr-o-Nasar (Islamabad) 13:10 (1976)

اقبالؔ اور حُسنِ ازل

شرف الدین اصلاحی

حسن وعشق کیا حقیقی وکیا مجازی اُردو شاعری کا ایک پسندیدہ اور پامال سا موضوع ہے۔ ہمارے شعراء نے اس کے داخلی اور خارجی پہلوؤں پر طبع آزمائی کر کے خوب خوب دادِ سخنوری دی ہے۔ دہلی کا دبستانِ شاعری ہو، یا لکھنؤ کا یا کوئی اور، اپنے اپنے رنگ میں ہر ایک نے اس مضمون کے انتہائی حسین و دلآویز مرقعے پیش کئے ہیں، جنہیں دیکھ کر شعراء کے فکر و فن کی عظمت کا قائل ہونا پڑتا ہے۔ لیکن اقبال جس حُسن کے دلدادہ ہیں وہ چیز ہی کچھ اور ہے۔ جس طرح جہانِ شعر میں ان کی دنیا الگ ہے ان کا تصورِ حسن بھی سب سے جداگانہ ہے۔ وہ حُسن کے مجازی جلوؤں کے شیدائی نہیں۔ وہ مادی حسن کے ڈھل جانے والے سایوں کا پیچھا نہیں کرتے۔ حسن کی عارضی لذتیں ان کا دامنِ دل نہیں کھینچ سکتیں۔ وہ حسن کے دلفریب کھلونوں سے نہیں بہلتے۔ وہ ایسے حسن کے پرستار ہیں جس کے آستانے پر دنیا جہان کے حسین اپنی جبینِ نیاز رکھتے ہیں۔ وہ اس حسن کے متلاشی ہیں جو ازلی ہے اور زوال سے آشنا نہیں ہوتا۔ وہ اس جمال دلفروز کے عاشق ہیں جس کے جلوہ رنگیں نے اس دنیا کی ہر چیز کو حسین بنا دیا ہے۔ جو خود بے نیاز ہے اور دنیا کے حسین جس کے در کے بھکاری ہیں۔ پھولوں میں وہی مسکراتا ہے، آبشاروں میں وہی گنگناتا ہے تاروں میں اسی کی دلبری ہے۔ ندیاں اسی کے گیت گاتی ہیں۔ چڑیوں کے چہچہوں میں وہی زمزمہ سنج ہے۔ بلبلیں اسی کی عاشق ہیں۔ پروانے اسی پر مرتے ہیں۔ پہاڑوں کی ہیبت، صحراؤں کی وحشت، دریاؤں کی سطوت اسی کے جمالِ جلال کا ایک رخ ہے۔ اقبالؔ کی اصطلاح میں اس حسن کا نام حسنِ ازل ہے۔

حسن پرستی شاعری کے خمیر میں داخل ہے۔ وہ شاعر، شاعر نہیں جو احساسِ حسن سے بے بہرہ ہو۔ حسن سے متاثر ہونا ہر ذی روح کا خاصہ ہے۔ انسان تو انسان حیوان کو بھی یہ ادراک بخشا گیا ہے۔

علامہ اقبالؔ اپنی ایک نظم میں بلّی سے مخاطب ہو کر کہتے ہیں :۔

کیا تجسّس ہے تجھے کس کی تمنائی ہے آہ کیا تو بھی اسی چیز کی سودائی ہے

حسن کی آغوش میں بلی کے پرسکون بیٹھنے سے وہ یہ نتیجہ اخذ کرتے ہیں کہ انسان سے فروتر مخلوقات میں بھی ذوقِ جمال پایا جاتا ہے :۔

خاص انسان سے کچھ حسن کا احساس نہیں صورت دل ہے یہ ہر چیز کے باطن میں مکیں

فرشتے تو اس احساس سے شاید بیگانہ رکھے گئے مگر خود اللہ تعالیٰ جل شانہٗ جو خود سراپا حسن ہیں، حسن کو پسند فرماتے ہیں۔ کہتے ہیں خدا خود خوبصورت ہے اور خوبصورتی کو پسند کرتا ہے "اللّٰہ جمیل و ھو یحبّ الجمال" اس پر دال ہے۔

اقبال حسن کا سودائی ہے۔ وہ یہ بھی جانتا ہے کہ عشق پابندیوں کا متحمل نہیں ہو سکتا۔ پھر بھی وہ حسن سے اذنِ جاں نثاری طلب کرتا ہے۔ اس لئے کہ حسن کی بارگاہ میں یہ بھی بے ادبی ہے کہ بلا اجازت اس کے سامنے اظہارِ تمنا کر دیا جائے :۔

عالم جوشِ محبت میں روا ہے سب کچھ کہیئے کیا حکم ہے دیوانہ بنوں یا نہ بنوں

یہ اقبالؔ ہی کا ایک شعر ہے۔ حسن پرستی اور بوالہوسی میں بڑا فرق ہے۔ اہل ذوق تو جان و دل نثار کرنے میں بھی تامل سے کام لیتے ہیں اس لئے کہ لطیف حسیات اس کی اجازت نہیں دیتیں۔

یہ شعر غالباً جگر مراد آبادی کا ہے :۔

حسن کی اک اک ادا پر جان و دل صدقے مگر لطف کچھ دامن بچا کر ہی نکل جانے میں ہے

غالباً زمانے کی عام بدمذاقی اور بھونڈے پن ہی کو دیکھ کر مرزا غالبؔ کو بھی کہنا پڑا تھا :۔

ہر بوالہوس نے حسن پرستی شعار کی اب آبروئے شیوۂ اہلِ نظر گئی

حسن کا آفاقی اور ماورائی تصور جسے اقبالؔ نے اپنے فلسفیانہ انداز بیان میں حسنِ ازل سے تعبیر کیا ہے، تصوّف کے نظریۂ وحدۃ الوجود یا وحدۃ الشہود سے ملتی جلتی سی چیز ہے۔ فلسفیوں کا ایک گروہ تو خود کائنات کی تخلیق کو حسنِ ازل کی ادائے خود نمائی کا نتیجہ قرار دیتا ہے۔ غالبؔ اس حقیقت کا بیان یوں کرتے ہیں :

دہر جز جلوۂ یکتائی معشوق نہیں ہم کہاں ہوتے اگر حسن نہ ہوتا خود بیں

اور اہلِ تصوّف کے یہاں تو خود اللہ تعالیٰ جل شانہ کا یہ قول بھی موجود ہے کہ "کُنتُ کنزاً مخفیاً فاحببت ان اعرف فخلقت الخلق - میں ایک مخفی خزانہ تھا میں نے چاہا کہ میں جانا جاؤں پس میں نے خلق کو پیدا کیا"۔ گویا مخلوق میں خود خالق جلوہ گر ہے۔ نقش اپنے نقاش کی دلیل ہوتا ہے۔ اس دنیا کی ہر حسین شئے اسی حسنِ ازل کا پرتو ہے۔ اقبالؔ کے کلام میں حسن کے خارجی و مادی تصورات کا ذکر بھی ملتا ہے لیکن جس چیز کو اقبالؔ نے ایک مستقل فلسفہ کی حیثیت سے پیش کیا ہے وہ حسن کا یہی تجریدی تصور ہے۔ وہ زندگی کے ہر مسئلے کی طرح حسن کو بھی عام سطح سے بلند ہو کر دیکھتے ہیں۔ علامہ کی ایک خوبصورت نظم جگنو ہے۔ موضوع بہت معمولی اور حقیر سا ہے۔ ایک کرمکِ شب تاب۔ مگر علامہ جگنو کی چمک دیکھ کر جو نتیجے نکالتے ہیں وہ بہت عظیم ہیں۔ ملاحظہ ہو:-

حسنِ ازل کی پیدا ہر چیز میں جھلک ہے — انساں میں وہ سخن ہے غنچے میں وہ چٹک ہے
یہ چاند آسماں کا شاعر کا دل ہے گویا — واں چاندنی ہے جو کچھ یاں درد کی کسک ہے
اندازِ گفتگو نے دھوکے دیئے ہیں ورنہ — نغمہ ہے بوئے بلبل بو پھول کی چہک ہے
کثرت میں ہو گیا ہے وحدت کا راز مخفی — جگنو میں جو چمک ہے وہ پھول میں مہک ہے

اس حقیقت کے ادراک کے باوجود کہ مظاہرِ فطرت کی ہر من موہنی صورت اسی حسنِ ازل کا عکسِ جمیل ہے، جب کبھی شاعر کا دیدۂ صورت پرست جہانِ رنگ و بو کے ان ظاہری جلوؤں میں کھو جاتا ہے اور حسنِ حقیقی تھوڑی دیر کے لئے نظروں سے اوجھل ہو جاتا ہے تو اس کی روح ماہیٔ بے آب کی طرح بے چین ہو جاتی ہے۔ اور وہ اپنے مطلوب کی جدائی میں جرس کی مانند نالہ و فریاد کرتا ہے۔ بانگِ درا کی ایک نظم "بچہ اور شمع" میں اقبال اس کیفیت کو نہایت دلنشین اور پُرشکوہ پیرائے میں پیش کرتے ہیں۔ پہلے بزمِ فطرت میں حسنِ ازل کے گوناگوں مناظر کا ذکر سن لیں:-

محفلِ قدرت ہے اک دریائے بے پایانِ حسن — آنکھ اگر دیکھے تو ہر قطرے میں ہے طوفانِ حسن
حسن کوہستاں کی ہیبت ناک خاموشی میں ہے — مہر کی ضو گستری شب کی سیہ پوشی میں ہے
آسمانِ صبح کی آئینہ پوشی میں ہے یہ — شام کی ظلمت شفق کی گل فروشی میں ہے یہ
عظمتِ دیرینہ کے مٹتے ہوئے آثار میں — طفلکِ ناآشنا کی کوششِ گفتار میں
ساکنانِ صحنِ گلشن کی ہم آوازی میں ہے — ننھے ننھے طائروں کی آشیاں سازی میں ہے

چشمۂ کہسار میں دریا کی آزادی میں حسن　　　شہر میں صحرا میں ویرانے میں آبادی میں حسن

اقبال کی نظر اپنے گرد و پیش پھیلی ہوئی کائنات کے ان متضاد عناصر میں ہم آہنگی پیدا کرنے والی قدر مشترک یعنی حسن مادی کو پاکر مطمئن نہیں ہو جاتی۔ اس لئے کہ سالک ابھی رہگذر میں ہے۔ خودی کی یہ منزل اولین ہے۔ یہ مسافر کا نشیمن نہیں بن سکتی۔ شاعر خود کو چاروں طرف سے حسن میں گھرا ہوا پاتا ہے۔ پھر بھی اس کی روح بے چین ہے۔ اسے کسی متاعِ گم گشتہ کی تلاش ہے۔ وہ مجاز کے رنگارنگ اور بوقلموں جلوؤں میں الجھ کر رہ جانا پسند نہیں کرتا۔ وہ اس اصل حقیقت کا جویا ہے جو کثرت میں وحدت اور تضاد میں ہم آہنگی کا راز ہے۔ اسلئے حسینانِ عالم کے ہجوم میں محصور ہونے کے باوجود وہ پکار اٹھتا ہے:۔

روح کو لیکن کسی گم گشتہ شے کی ہے ہوس　　　ورنہ اس صحرا میں کیوں نالاں ہے یہ مثلِ جرس

حسن کے اس عام جلوے میں بھی یہ بیتاب ہے　　　زندگی اس کی مثالِ ماہیٔ بے آب ہے

وہ گم گشتہ شے کیا ہے روح کو جس کی تلاش ہے۔ وہ وہی حسنِ ازل ہے جو ہر حسین شے میں پنہاں ہے:۔

چھپایا حسن کو اپنے کلیم اللہ سے جس نے　　　وہی ناز آفریں ہے جلوہ پیرا نازنینوں میں

اور جس کی جلوہ گاہ خود انسان کا اپنا دل ہے:۔

جنہیں میں ڈھونڈتا تھا آسمانوں میں زمینوں میں　　　وہ نکلے میرے ظلمت خانۂ دل کے مکینوں میں

سُلیمیٰ کی آنکھوں میں بھی وہی ہے:۔

ہر شے میں ہے نمایاں یوں تو جمال اس کا　　　آنکھوں میں ہے سلیمیٰ تیری کمال اس کا

تاروں کی دلبری میں بھی وہی خود نما ہے:۔

حسنِ ازل ہے پیدا تاروں کی دلبری میں　　　جس طرح عکسِ گل ہو شبنم کی آرسی میں

اور لالہ و گل کے پردے میں بھی وہی چھپا ہوا ہے:۔

حسنِ ازل کہ پردۂ لالہ و گل میں ہے نہاں　　　کہتے ہیں بیقرار ہے جلوۂ عام کے لئے

حسنِ ازل جلوۂ عام کے لئے بے قرار ہوتے ہوئے بھی تنک جلوہ کیوں ہے۔ کیوں ایک جھلک دکھلاتا ہے اور روپوش ہو جاتا ہے۔ یہ کیا بات ہے کہ چلمن سے لگے بیٹھے ہیں۔ صاف چھپتے بھی نہیں سامنے آتے بھی نہیں۔ بات یہ ہے کہ چھپنا اور تڑپانا حسن کا شیوہ ہے۔ حسن اگر اتنا عام ہو جائے کہ

آسانی سے ہر کسی کے ہاتھ آئے تو وہ اپنی قدر کھو بیٹھے۔ علامہ اپنی ایک نظم "حقیقتِ حسن" میں فرماتے ہیں:

ہوتی ہے رنگِ تغیر سے جب نمود اس کی — وہی حسیں ہے حقیقت زوال ہے جس کی

اسی مفہوم کو جگر مراد آبادی یوں بیان کرتے ہیں:

حسن وہی ہے حسن جو ظالم — ہاتھ لگائے ہاتھ نہ آئے

حسن اگر ہاتھ آجائے تو حسن باقی نہ رہے۔ وصل میں مرگ آرزو ہے۔ حیاتِ دوام سوختنِ ناتمام کا نام ہے۔ شوق ہی مر گیا تو حسن کی تمنا کون کرے گا۔ یہ درست ہے کہ حسن خود منتظرِ عشق جواں ہوتا ہے۔ لیکن عشق کو زندگی اور توانائی بخشنے والی یہی حسن کی گریز پائی ہے۔ حسنِ ازل سے زیادہ اس نکتے کو اور کون جانتا ہے۔ اسی لئے وہ مشہود بھی ہے مستور بھی ہے۔ ھوالاول والآخر والظاھر والباطن فانیٰ تصرفون۔ وہی ابتدا ہے وہی انتہا ہے۔ وہی کھلا ہے وہی چھپا ہے۔ سو تم کہاں بھٹکتے پھر رہے ہو۔ اس حقیقت کی طرف اقبال نے جابجا اپنے کلام میں اشارہ کیا ہے۔ ع

وصل میں مرگِ آرزو، ہجر میں لذتِ طلب

فارسی کا ایک مشہور شعر ہے:۔

تو نشناسی ہنوز شوق بمیرد ز وصل — چیست حیاتِ دوام سوختنِ ناتمام

"عاشق ہرجائی" والی نظم کے آخری چند شعر بھی اسی مضمون کی ترجمانی کرتے ہیں:۔

فیضِ ساقی شبنم آسا ظرفِ دل دریا طلب — تشنۂ دائم ہوں آتش زیر پا رکھتا ہوں میں

محفلِ ہستی میں جب ایسا تنک جلوہ تھا حسن — پھر تخیل کس لئے لا انتہا رکھتا ہوں میں

در بیابانِ طلب پیوستہ می کوشیم ما — موجِ بحریم و شکستِ خویش بر دوش ایم ما

اب تک آپ نے حسن کے متعلق اقبال کے جن افکار و خیالات کو دیکھا وہ بیشتر عالمِ بالا کی باتیں تھیں۔ علامہ نے اس دنیا کی باتیں بھی کی ہیں مگر بہت کم اور یہاں بھی ان کی خود کو لئے دیئے رہنے والی کیفیت برقرار رہتی ہے۔ بانگِ درا کی ایک نظم ہے، عاشق ہرجائی۔ اس میں عاشق ہرجائی سے مراد علامہ کی اپنی ذات ہے۔ خود سے مخاطب ہو کر کہتے ہیں:۔

حسنِ نسوانی ہے بجلی تیری فطرت کے لئے — پھر عجب یہ ہے کہ تیرا عشق بے پروا بھی ہے

تیری ہستی کا ہے آئینِ تفنن پر مدار　　تو کبھی ایک آستانے پر جبیں فرسا بھی ہے؟

ہے حسینوں میں وفا نا آشنا تیرا خطاب　　اے تلون کیش تو مشہور بھی رسوا بھی ہے

یہ ایک بھونرے کا کردار ہے جو ریاضِ حسن میں کبھی اِس پھول پر اور کبھی اُس پھول پر منڈلاتا ہے۔ ظاہر ہے یہ بات سنجیدہ لوگوں میں معیوب سمجھی جاتی ہے۔ علامہ فوراً ہرجائیت میں یکجائیت لیے وفائی میں وفا شعاری کا پہلو ڈھونڈ نکالتے ہیں۔ اسی نظم میں چند شعروں کے بعد کہتے ہیں:-

گو حسینِ تازہ ہے ہر لحظہ مقصودِ نظر　　حسن سے مضبوط پیمانِ وفا رکھتا ہوں میں

ایک نظم "طفلِ شیر خوار" میں حسنِ ظاہری پر بچوں کی طرح لپٹنے مچلنے کا ذکر کرتے ہیں مگر ساتھ ہی یہ احساس بھی ہے کہ یہ بات نادانی کی ہے۔ فرماتے ہیں:-

میری آنکھوں کو لبھا لیتا ہے حسنِ ظاہری　　کم نہیں کچھ تیری نادانی سے نادانی مری

اس عالمِ رنگ و بو میں مصورِ فطرت کا سب سے حسین شاہکار پھول ہے۔ اس پیکرِ حسن پر اہلِ ہوس کے ہاتھوں کیا گزرتی ہے بتانے کی ضرورت نہیں۔ چمن سے لے جا کر بازار میں اسے چند کوڑیوں کے عوض فروخت کر دیا جاتا ہے۔ غالبؔ نے باغباں کے اس عمل کو آبرو پر ڈاکہ ڈالنے سے تعبیر کیا ہے:-

غارت گرِ ناموس نہ ہو گر ہوسِ زر　　کیوں شاہدِ گل باغ سے بازار میں آوے

شاہدِ گل کا یوں سرِ بازار نیلام ہونا کتنا الم انگیز منظر ہے۔ ایک شاعر کا حساس دل اس منظر کی تاب نہیں لا سکتا۔ اس کے تصور ہی سے وہ لرزہ براندام ہو جاتا ہے۔ لیکن کفِ افسوس ملنے کے سوا وہ کچھ کر نہیں سکتا۔ اقبال پھول کو دیکھتے ہیں تو ان کی نظر اس کے انجام تک پہنچ جاتی ہے۔ انہیں معلوم ہے کہ آغوشِ فطرت کی پلی یہ حسین معصوم دوشیزہ کسی ظالم گلچیں کی ہوسِ زر کا نشانہ بنے گی۔ ان کا دل بھر آتا ہے۔ ان پر رقت طاری ہو جاتی ہے۔ پھر تصور میں وہ یہ بھی دیکھتے ہیں کہ پھول انہیں دیکھ کر سہم سا گیا ہے۔ شائد اس نے انہیں بھی گلچیں سمجھا۔ اقبالؔ فوراً صفائی کی ضرورت محسوس کرتے ہیں وہ پھول کو تسلی دیتے ہیں کہ وہ گلچیں نہیں وہ اسے دیکھتے ضرور ہیں مگر بُرے ارادے سے نہیں ان کے پہلو میں ایک سچے عاشق کا دل ہے۔ وہ اسے بلبل کی آنکھ سے دیکھتے ہیں:-

توڑ لینا شاخ سے تجھ کو مرا آئیں نہیں　　یہ نظر غیر از نگاہِ چشمِ صورت بیں نہیں

آہ یہ دستِ جفا جو اے گلِ رنگیں نہیں　　کس طرح تجھ کو یہ سمجھاؤں کہ میں گلچیں نہیں

کام مجھ کو دیدۂ حکمت کے الجھیڑوں سے کیا　　دیدۂ بلبل سے میں کرتا ہوں نظارہ ترا

حسن کے متعلق اقبال کے افکار و خیالات آپ نے ملاحظہ فرمائے۔ اقبال کے فکر کی بلندی اور فن کی عظمت کا صحیح اندازہ اس وقت ہوتا ہے جب ہم ان کا موازنہ دوسروں سے کرتے ہیں۔ حسن و عشق اُردو شاعری کا نہایت پامال موضوع ہے۔ ہمارے شاعروں نے بے شک لپنے موئے قلم سے صناعی کے نادر نمونے پیش کئے ہیں۔ مگر اتنا اعلیٰ تخیل اور پاکیزہ اسلوب آپ کو شاذ و نادر ہی کسی اور کے یہاں ملے گا۔ اُردو شاعری میں اس عنوان کے تحت لب و رخسار کی باتیں ہیں' زلف و عارض کے قصّے ہیں' یا گل و بلبل کے افسانے۔ اور پیرایۂ بیان ایسا بے محابا کہ بے حجابی کو بھی پسینہ آجائے۔ ہمارا "خدائے سخن" بھی جب اس عنوان پر قلم اٹھاتا ہے تو اس قسم کے اشعار تراوش کرتے ہیں :-

نازکی اس کے لب کی کیا کہئے　　پنکھڑی اک گلاب کی سی ہے

میر ان نیم باز آنکھوں میں　　ساری مستی شراب کی سی ہے

اور ہمارا "حکیمِ فرزانہ" جب اس کوچے میں نکلتا ہے تو اس قسم کے اشعار گنگناتا ہے :-

نینداس کی ہے دماغ اس کا ہے راتیں اس کی ہیں　　تیری زلفیں جس کے بازو پر پریشاں ہو گئیں

یا

مانگے ہے پھر کسی کو لبِ بام پر ہوس　　زلفِ سیاہ رخ پہ پریشاں کئے ہوئے

چند قدم اور آگے بڑھتا ہے تو یوں کھل کھیلتا ہے :-

ہم سے کھل جاؤ بوقتِ مےپرستی ایک دن　　ورنہ ہم چھیڑیں گے رکھ کر عذرِ مستی ایک دن

دھول دھپا اس سراپا ناز کا شیوہ نہیں　　ہم ہی کر بیٹھے تھے غالب پیش دستی ایک دن

یہ تو ہمارے معتبرین کا حال ہے۔ تا بہ دیگراں چہ رسد۔ دوسری طرف اس موضوع پر اقبال کے کلام کا مطالعہ کریں تو عالم ہی اور نظر آتا ہے۔ بے شک اقبال کی شاعری ساحری نہیں پیغمبری کی ہم دوش ہے حسن کی سرکار سے اس عاشق حسن و جمال کا جو تعلق ہے وہ اپنی لطافت میں ایسے بے محابا بیان کی آلائش کو کہاں برداشت کر سکتا ہے۔ وہ "عاشقی" میں بھی "عزت سادات" کا خیال رکھتا ہے۔ حسن مجازی سے بات کرنے میں بھی اس کا لب و لہجہ باوقار رہتا ہے :-

نہ آتے ہمیں اس میں تکرار کیا تھی — مگر وعدہ کرتے ہوئے عار کیا تھی

تمہارے پیامی نے سب راز کھولا — خطا اس میں بندے کی سرکار کیا تھی

ابتدائے مشقِ سخن میں اقبالؔ نے اس طرح کے رسمی اشعار بھی کہے۔ لیکن جلد ہی وہ ان فرسودہ راہوں کو چھوڑ کر آگے نکل گئے جہاں ان کا مقام اُردو شعراء میں بالکل ممتاز نظر آتا ہے۔

●